# مسلمانوں کی فرقہ بندیوں کا افسانہ

از

(حضرت مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی)

(سلسلہ کے لئے برہان بابتہ جون ۵۲ء دیکھئے)

جیسا کہ عرض کرتا چلا آرہا ہوں کہ ایسے اختلافات جنہیں صحیح معنوں میں ہم اصولی اختلافات کہہ سکتے ہیں زیادہ تر ان کی پیدائش میں سیاسی اختلافات کو ہم دخیل پاتے ہیں، یا پھر باہر سے مسلمانوں کے اندر چیزیں مختلف راہوں سے داخل ہوتی ہیں، خیالات پر وہ بھی اثر انداز ہوئیں، ابتداء اسلام میں مختلف دینی قوموں کے افراد مسلمان ہو ہو کر اسلامی دائرہ میں داخل ہو رہے تھے، اپنے ساتھ اپنے آبائی عواطف موروثی رجحانات کو بھی وہ لائے بجائے تصحیح کے یعنی دین کی قدرتی کتاب کا آخری اڈیشن قرار دے کر قرآن سے تصحیح کا کام لیتے۔ بعضوں نے تطبیق کا ارادہ کیا۔ چاہا کہ خاندانی روایات و احساسات میں تھوڑی بہت ترمیم کرکے ان کو قرآنی نصوص کے مطابق بنالیں۔ یا قرآنی تعلیمات کو کھینچ تان کر اپنے آبائی خیالات پر منطبق کرکے دونوں ہی سے اپنا تعلق باقی رکھیں۔ کرنے والے جان بوجھ کر ایسا کرتے تھے اس بدگمانی سے بچتے ہوئے زیادہ سے زیادہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ غیر شعوری طور پر اپنے آبائی مالوفات سے قطعی بے گانگی ان کے لئے آسان بھی نہ تھی۔ بہرحال دانستہ ہو، یا نادانستہ، مگر ہوا یہی کہ تاویل و تعبیر یا کھینچ تان کی اس نکوہیدہ و ناپسندیدہ کوشش نے مسلمانوں میں ایسے خیالات پیدا کردئے جنہیں صحیح معنوں میں نہ تو اسلامی تعلیمات ہی کا صحیح نتیجہ قرار دیا جاسکتا تھا، اور سچ پوچھئے تو ان کے موروثی عقائد بھی اپنے اصلی رنگ کو کھو کر نئے قالب میں جلوہ گر ہوتے۔ یہی قدر کا مسئلہ ہے۔ تاریخی شواہد کی روشنی میں آپ پڑھ چکے کہ قدر کا یہ نظریہ جو آج کل ہماری کتابوں میں مسلمانوں کے فرقہ معتزلہ کی طرف منسوب ہے یعنی اپنے اختیاری اعمال و افعال کے خالق خود بندے ہیں، خدا کی تخلیقی کارفرمائیوں

کا ان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ قدر کے اس عقیدے کی بنیاد توڑ دالی مسلمانوں میں ایک پارسی نو مسلم منسوبہ نامی نے جو ایرانی فوج کے اسواریوں سے تعلق رکھتا تھا بات وہی تھی کہ کائنات میں شر یا برائی کا پہلو جن چیزوں میں پایا جاتا ہے۔ ایرانی ذہنیت قرنہا قرن سے عادی تھی کہ ان کی آفرینش اور خلق سے حق تعالیٰ کی ذات کو پاک قرار دے۔ ساری برائیوں کی پیدائش کا الزام اہرمن کے سر تھوپ دیا جاتا تھا۔ اس باب میں ایران کے باشندوں کی حسی نزاکت اس درجہ تک ترقی کر گئی پہنچ چکی تھی کہ "اہرمن" کے لفظ لکھنے کی ضرورت ہوتی، تو بیان کیا جاتا ہے، کہ الٹ کر ہرمہا کی شکل میں اسے لکھتے تھے[1]۔ مقصود اور مطلب یہی تھا کہ خدا جسے وہ اہرمزدا کہتے تھے اس کے دامن کو شرور اور برائیوں کے انتساب سے پاک رکھا جائے، گویا ان کے نزدیک خدا کی تقدیس و تسبیح کی شکل یہی یہ تھی کہ شرور اور برائیوں کو اس کے دائرۂ تخلیق سے خارج کر دیا جائے[2]۔

ظاہر ہے کہ خلقِ شر کے متعلق جن کی ذہنی نزاکتوں کا یہ حال ہو قبولِ اسلام کے بعد اگر بندوں کے برے اعمال و افعال کا خالق بجائے خدا کے بندوں ہی کو وہ ٹھہرانے لگے، اور برے اعمال و افعال کے بعد لازمی طور پر نیک اعمال کے خلق و آفرینش کو بھی بندوں ہی کی طرف منسوب کرنا ناگزیر تھا، یہی خلق افعال کا

---

[1] دیکھو اے مینول آف بائیبل ہسٹری بلیکی صفحہ ۱۴۹ ترجمہ اردو، اس موقعہ پر بے ساختہ اپنے ایک مرحوم استاذ غفر اللہ لہ کا خیال آ رہا ہے، مولینا نصیر احمد ان کا نام تھا وطن بھلت تھا ٹونک میں مدرسہ خلیلیہ کے صدر مدرس تھے منطق و اصول فقہ وغیرہ کی بعض ابتدائی کتابیں خاکسار نے ان سے پڑھی تھیں، ان کا دستور تھا کہ پوسٹ کارڈ یا لفافے پر ٹکٹ بجائے سیدھے طریقے کے الٹ کر لگاتے، کارڈ اور لفافے کی تصویر نیچے پڑ جاتی، دریافت پر بولے کہ انگریزوں کی توہین و تحقیر کی ایک شکل یہی ہے کہ اس کے بادشاہ کی منڈی کی تصویر اوندھی کر دی جائے ۱۲ [2] یہاں تفصیل کا تو موقعہ نہیں ہے لیکن خیر و شر کے الفاظ تو بیشک جدا جدا ہیں مگر سوچنے کی بات یہ ہے کہ الفاظ سے ہٹ کر دیکھنا چاہئے کہ واقعہ کی نوعیت کیا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ ایک ہی چیز ہوتی ہے جو استعمال سے کبھی خیر کبھی شر بن جاتی ہے آگ ہی کو لیجئے کھانا پکانے روشنی حاصل کرنے کا کام اس سے لیا جائے تو بہترین شے ہے لیکن اسی آگ سے گھر جلا دیتے جائیں۔ کھیتیاں جھلسا دی جائیں تو شر بن جاتی ہے ایسی صورت میں سمجھ میں نہیں آتا کہ ایران کے ارباب دانش نے ایک ہی مخلوق کے لئے دو خالق کے نظریہ کو بنایا کیسے استعمال کی صحت سے ہر بری شے بھلی بن جاتی ہے اور استعمالی غلطی سے بھلی سے بھلی چیز بھی بری بن جاتی ہے گویا اس لحاظ سے مشکل ہی سے ایسی کوئی چیز رہ جاتی ہے جو خدا کی مخلوق بننے کی مستحق ہو تفصیل کے لئے ہماری کتاب الدین القیم کا مطالعہ کیا جائے ۱۲

مسئلہ ہے جس کی اصطلاحی تعبیر قدر کے لفظ سے کی جاتی ہے۔ واقعہ یہ تھا کہ اختیاری اعمال و افعال کی جزا و سزا کے قانون کی تصحیح کے لئے ناگزیر ہے کہ بندوں کو بھی ان کے افعال کی پیدائش میں اس حد تک دخیل مانا جائے کہ فعل کی ذمہ داری کرنے والوں کے سر عاید ہو سکے۔

لیکن اسی کے ساتھ خالق قیوم کا اپنے کن فیکونی مخلوقات[1] سے جو تعلق ہوتا ہے، اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے عقل اس کو بھی سوچ نہیں سکتی کہ بندے جو خدا کی کن فیکونی مخلوقات ہیں، اپنے اعمال و افعال کی تخلیق و آفرینش میں کلیتہً استقلالی اقتدار کے مالک ہیں، بلکہ نصوص کا اقتضاء بھی یہی ہے اور عقل بھی حقیقت سے آگاہ ہونے کے بعد اسی فیصلہ پر مجبور ہے کہ اپنے وجود میں، صفات میں، جیسے ہر لمحہ خالق تعالیٰ کی تخلیقی کارفرمائیوں کے دست نگر ہیں، اسی طرح اعمال و افعال جو بندوں سے صادر ہوتے ہیں، ان کی تخلیق و آفرینش کا تعلق بھی براہ راست خالق کائنات ہی کے مسلسل تخلیقی فیض اور ارادے کے ساتھ وابستہ تسلیم کیا جائے،

الغرض بندوں کے اعمال و افعال اختیاری کی تخلیق میں خدا کے ساتھ کچھ نہ کچھ کسی نہ کسی حیثیت سے بندوں کو بھی دخل ہے، واقعہ کی اصل حقیقت یہی ہے اور اسلامی وثائق میں نصوص جو پائے جاتے ہیں، ان میں واقعہ کے دونوں پہلوؤں کی طرف اشارے کئے گئے ہیں، مسئلہ کو اسی اجمالی رنگ میں لوگ مانتے چلے آرہے تھے۔ لیکن یہی منسوبہ ایرانی پہلا آدمی تھا جس نے مسلمانوں میں بجائے اجمال کے چاہا کہ بندوں

---

[1] کن فیکونی مخلوقات کی اصطلاح کو سمجھنے کے لئے چاہیے کہ ہم میں ہر شخص خود اپنے اندر غور کرے، اپنے معلومات کو خیالی قوت سے ہم جو پیدا کرتے ہیں، سوچئے کہ اس وقت کیا ہوتا ہے، دلی کی جامع مسجد کو آپ جانتے ہیں پلنگ پر لیٹے لیٹے خیالی قوت سے اپنے اسی معلوم یعنی جامع مسجد کو اپنے سامنے آپ کھڑی کر لیتے ہیں۔ یہ آپ کی تخلیقی کارفرمائی ہے غور کیجئے کہ یہ خیالی جامع مسجد جو آپ کے ذہن کے سامنے کھڑی ہے صرف پیدا ہونے ہی میں آپ کے ارادے کی محتاج نہیں ہے بلکہ باقی رہنا اس کا یہ بھی آپ کی توجہ کے ساتھ وابستہ ہے، اسی کو کن فیکونی مخلوق کہتے ہیں کہ ارادے کے ساتھ آپ کا معلوم آپ کی مخلوق بن جاتا ہے اسی طرح زید کے [illegible] جانتے ہیں اور آپ کا معلوم ہے [illegible] قوت سے اسی معلوم کو اپنی مخلوق بنا کر دیکھئے وہ اپنی پیدائش میں بھی [illegible] میں بھی آپ کے تخلیقی ارادے کا [illegible] کا، [illegible] کا وجود بھی، اس کے صفات بھی اس کے افعال بھی سب کی حالت یہی [illegible] آپ [illegible] تو [illegible] کا [illegible] کے [illegible] ہے تو ہنسنے کا یہی مطلب ہے کہ [illegible] محتاج ہوتی ہے ۱۲

کے اعمال و افعال کے تخلیقی عمل سے خدائی ارادے کو قطعاً بے تعلق ٹھہرا دیا جائے۔ اسی کے مقابلہ میں ایک دوسرا فرقہ اٹھ کھڑا ہوا، جو جبر محض کے خیال کو مسلمانوں میں پھیلانے لگا، حاصل جس کا یہی ہے کہ بندہ مجبور محض ہے، نیک و بد اعمال جو بھی بندوں سے صادر ہوتے ہیں، ان کو براہ راست خدا پیدا کرتا ہے، بندے کے ارادہ اور اختیار کو ان میں کسی قسم کا کوئی دخل نہیں ہے۔

کہتے ہیں کہ تابعین (یعنی صحابہ کے تعلیم یافتہ طبقہ) ہی کے زمانہ میں جبر کے اس نظریہ سے مسلمانوں کو سب سے پہلے ایک شخص جہم نامی نے آشنا کیا تھا۔ اسی کی طرف منسوب ہو کر جہمیہ نامی فرقہ پیدا ہوا۔ اسلام کی ابتدائی صدیوں کو جہم اور جہمیہ کے چرچوں سے ہم معمور پاتے ہیں۔

مگر جہم کون تھا کن لوگوں سے متاثر ہوا جبر کے سوا اور بھی کس کس قسم کے اعتقادی اختلافات کی مسلمانوں میں اس کی وجہ سے بنیاد پڑی۔ یہی سننے کی بات ہے۔

واقعہ یہ ہے، کہ ہندوستانی تاجروں کا جو قافلہ بلخ ہوتا ہوا سمرقند جایا کرتا تھا، اس کو راستہ میں مشہور خراسانی شہر ترمذ کے قریب نوبیدہ نامی مقام پر دریائے زامل کو عبور کرنا پڑتا تھا، جو جیحوں کا معاون دریا ہے، یہ نوبیدہ ہمارے یاں کی تاریخوں میں قرب مکانی کی وجہ سے معبر ترمذ کے نام سے موسوم تھا یعنی ترمذ کی گذیا گھاٹ اس کو کہتے ہیں، اسی معبر ترمذ پر محصول وصول کرنے والوں کی ایک چوکی تھی، بنی امیہ کا زمانہ تھا ہشام بن عبدالملک کی حکومت کے ایام میں معبر ترمذ (نوبیدہ) کی چوکی کا داروغہ جہم بن صفوان نامی ایک آدمی تھا حافظ ابن حجر نے لسان المیزان میں لکھا ہے کہ

| | |
|---|---|
| کان جہم من موالی بنی راسب | بنی راسب عربی قبیلہ کے غلاموں کے خاندان سے اس کا |
| ۲ ج ۱۴۲ | تعلق تھا۔ |

---

لہ ہشام بن عبدالملک پہلی صدی ہجری کے اختتام اور دوسری کی ابتدا یعنی ۱۰۵ھ میں گدی نشین ہوا، امام احمد بن حنبل کے حوالہ سے حافظ ابن حجر نے نقل کیا ہے کہ ہشام بن عبدالملک کے زمانہ کے دواوین (سرکاری کاغذات) میں جہم کا ذکر میں نے پایا (فتح الباری ص ۲۹۹ ج ۲) اسی سے سمجھا جاتا ہے کہ ہشام کے عہد حکومت میں جہم سرکاری ملازم تھا کون کہہ سکتا ہے کہ اس کی ملازمت کا سلسلہ کب سے شروع ہوا تھا بہرحال پہلی صدی ہجری میں اس کا وجود یقینی ہے ۱۲

اب خواہ غلاموں کے جس خاندان سے بھی جہم کا تعلق تھا، وہ آزاد ہوگیا ہو، یا آزاد نہ ہوا ہو، بہرحال تھا اس کا نسلی تعلق موالی ہی سے۔ اسی لئے صحیح طور پر یہ کہنا دشوار ہے کہ وہ عربی نژاد تھا بھی یا نہیں گو بعض ہو لکھنے والوں نے اسی کے ساتھ یہ بھی لکھا ہے کہ ابتدائی زندگی جہم کی کوفہ میں گذری تھی، فصیح عربی زبان بولتا تھا۔ فتح الباری میں حافظ نے نقل کیا ہے کہ

کان جہم من اہل الکوفۃ وکان فصیحا ص۲۹۵ ج۱۳ — جہم کوفے کا رہنے والا تھا اور فصیح زبان بولتا تھا

لیکن اسی کے ساتھ ایک سے زیادہ مورخوں کا بیان یہ بھی ہے کہ

لم یکن لہ علم ولا مجالسۃ اہل العلم — نہ خود علم والا تھا، اور نہ اہل علم کی صحبت ہی اسے میسر آئی تھی۔ فتح الباری ص

اسی لئے جنگی کی چوکی کی معمولی ملازمت ہی اس کو مل سکی تھی، حافظ ہی نے لکھا ہے

کان علی معابر ترمذ ،، — ترمذ کی گذر پر اس کا تقرر ہوا تھا

جہم کے یہ تو مختصر ذاتی حالات تھے۔

اب سنئے، ذہبی نے اپنی کتاب العلو میں یہ روایت نقل کی ہے کہ جس زمانہ میں جہم ترمذ کی اسی گذر والی چوکی میں مقیم تھا،

فکلم السمنیۃ فقالوا صف لنا ربک الذی تعبد ص۱۳ کتاب العلو مطبوعہ منار — جہم کی سمنیہ فرقہ والوں سے بات چیت ہوئی، سمنیہ فرقہ والوں نے پوچھا کہ جس خدا کو تو پوجتا ہے، اس کے صفات بیان کر

آپ نے سمجھا سمنیہ کے اس لفظ سے کیا مراد ہے، جاننے والے جانتے ہیں کہ ہندوستان کے مذہبی فرقہ کی تعبیر مسلمانوں کے علم کلام کی کتابوں میں سمنیہ کے لفظ سے کی جاتی ہے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سومنات کی طرف منسوب کر کے مسلمانوں نے ان لوگوں کو سمنیہ کہنا شروع کیا تھا واللہ اعلم بالصواب

عرض کر چکا ہوں کہ بلخ کے مسافر سمرقند جانے کے لئے ترمذ کے اسی معبر ثویدہ سے گذرتے تھے اور بلخ ہی وہ مقام تھا جو باب الہند سمجھا جاتا تھا، ہندوستان کے تجار خراسان جانے کے لئے پہلے بلخ

ہی پہنچتے تھے بلخ میں باب الہند کے نام سے اسی لئے ایک مستقل دروازہ تھا[1]،

بہرحال کہنا یہ ہے کہ ہندوستان کے تاجروں ہی کی طرف سے جہم بن صفوان کے دل میں پہلی دفعہ یہ سوال ڈالا گیا۔ اس وقت تک مسلمانوں کا حال یہ تھا کہ قرآن پڑھتے تھے۔ اس میں خدا کے متعلق یہ بھی تھا کہ الرحمٰن عرش پر مستوی ہے۔ اور اسی کے ساتھ یہ بھی اسی قرآن ہی میں موجود ہے کہ وہی ہر شے کو محیط ہے وہی ہر ایک کے ساتھ ہے، وہ حبل الورید (گردن کی شہ رگ) سے بھی زیادہ قریب ہے، وہی اول ہے وہی آخر ہے، وہی ظاہر ہے وہی باطن ہے وہی آسمانوں اور زمینوں کا نور ہے[2]۔ الغرض مسلمان عرش والی آیت کو بھی پڑھتے تھے اور دوسری آیتیں بھی برابر ان کی تلاوت میں گذرتی رہتی تھیں، ان کے ایمان میں دونوں ہی کی گنجائش تھی، حقیقت بھی ان ہی اجمالی تعبیروں میں پوشیدہ تھی کچھ یہ بھی کچھ وہ بھی، ٹھیک جیسے خلق افعال کے قصے میں کچھ یہ بھی صحیح کچھ وہ بھی صحیح یہی واقعیت کی صحیح ترجمانی ہے،

لیکن جہم جو نہ خود علم سے بہرہ رکھتا تھا اور نہ علماء کی صحبتوں سے مستفید ہونے کا موقع اس کو ملا تھا اچانک "ہندی فلسفہ" کی لاحاصل موشگافیوں سے اس کا دماغ دوچار ہوا، لکھا ہے، کہ سوال کے بعد

فدخل البیت لا یخرج مدۃ (فتح الباری ج ۱۳ ص ۲۹۶)    جہم کوٹھری میں گھس گیا اور زمانہ تک باہر نہ نکلا،

یہ بھی بیان کیا جاتا ہے، کہ چالیس دن تک مبہوت رہا، جن میں نماز بھی اس نے نہ پڑھی، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سمنیہ (ہندی تاجروں) نے صرف سوال ہی کر کے چھوڑ نہیں دیا تھا، بلکہ سوال و جواب کا سلسلہ بھی دونوں طرف سے جاری رہا،

امام بخاری نے اپنی کتاب "افعال العباد" میں جو روایت اسی سلسلہ میں درج کی ہے۔ اس کے ان الفاظ سے یعنی

---

[1] ان جغرافیائی معلومات کے لئے جی۔ لی۔ اسٹرینج کی کتاب "جغرافیہ خلافت مشرقی" کا مطالعہ کرنا چاہئے جس کا اردو ترجمہ دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ نے شائع کیا ہے ۱۲ [2] فلیفۃ الشریعۃ انسان خود اپنے اندر دیکھتا ہے کہ اس کی روح بدن کے کسی حصہ سے غائب نہیں ہوتی ہر ایک پر شاہد و حاضر ہے تاہم قلب کے ساتھ اسی روح کا خاص استوائی تعلق ہے۔ ایسا تعلق کہ سارے بدنی نظام کا کاروبار اسی سے چل رہا ہے قلب سے روح کا استوائی تعلق جس وقت ختم ہو جاتا ہے بدن کے سارے اجزاء منتشر اور پراگندہ ہو جاتے ہیں ۱۲

| | |
|---|---|
| فحاصمه بعض اسمنية فشك فاقام | جہم سے سمنیہ فرقہ کے بعض لوگوں نے مباحثہ کیا، پس |
| اربعين يوما لا يصلي ص۶۹ | جہم شک میں مبتلا ہوگیا اور چالیس دن ایسے گذارے |
| | جن میں نماز نہ پڑھی |

ان سے تو صراحۃً معلوم ہوتا ہے کہ جہم اور سمنیہ میں کافی گفتگو ہوئی، اس کے بعد دیکھا گیا کہ لوگوں کے سامنے اپنے عقیدے کا اظہار حضرت حق سبحانہ و تعالیٰ کے متعلق یہی جہم ان الفاظ میں کر رہا ہے کہ

| | |
|---|---|
| هو هذا الهواء مع كل شي و في كل شي | وہ (خدا) یہی ہوا ہے ہر چیز کے ساتھ ہر چیز میں اور اس سے |
| ولا يخلو منه شي ص۲۹۵ ج۱۳ فتح الباری | (خدا) سے کوئی چیز خالی نہیں، |

اور یہی تھا اس غلط وحدت الوجود کا تخم اول جسے مسلمان صوفیوں کے بعض طبقات میں غیر معمولی ہر دلعزیزی حاصل ہوئی، مسئلہ کی ابتدائی تعبیر ایک سادہ دل، غیر علمی آدمی کی یہی ہو سکتی تھی، عرش پر الرحمٰن کا استواء جو قرآن کا منصوص مسئلہ تھا۔ اس کا مضحکہ اڑایا گیا اور اجمال جو مسئلہ کی روح تھی، جہم نے چاہا کہ مسلمانوں کو اس سے ہٹا دے، اس کے مقابلہ میں ایک طبقہ پیدا ہوا جو عرش والے نص کو اصل قرار دے کر قرآن ہی کے دوسرے بیانات جن میں احاطہ معیت قرب اقربیت اولیت و آخریت ظاہریت و باطنیت کا صراحۃً ذکر کیا گیا ہے، ان سب کی اللہ کے بندوں نے تاویل کی۔ ابہام و اجمال کی قدر و قیمت گم ہوگئی دو مستقل فرقے عرشیوں اور فرشیوں کے پیدا ہو گئے،

ان عرشیوں اور فرشیوں کا قصہ اتنا دراز ہے جس کے لئے اس مختصر سے مضمون میں بھلا کیا گنجائش پیدا ہو سکتی ہے۔[1]

---

[1] امام بخاری نے اپنی کتاب خلق افعال العباد میں ایک روایت درج کی ہے جس میں راوی نے بیان کیا ہے کہ قرآن کی سورۂ طٰہٰ کی آیت الرحمٰن علی العرش استوٰے کا ذکر کرتے ہوئے جہم ایک دن بولا کہ کاش! میرے بس کی بات ہوتی تو اس آیت کو قرآن سے چھیل کر نکال دیتا۔ یہ بھی فرشیوں کی اس مجرمانہ آرزو کے مقابلہ میں منہ سے تو کہتے ہوئے نہیں سنا ہے لیکن عرشیوں کے دل میں بھی قرب احاطہ معیت اقربیت اولیت اخیرت ظاہریت باطنیت والی آیتوں کے متعلق اسی قسم کے تمنائی بھپہادے اضطراراً اگر اٹھتے ہوں تو اس پر تعجب نہ ہونا چاہئے آخر عرش کے استواء والی ایک آیت کو اصل قرار دے کر قرآن کی بیسیوں آیتوں کے ساتھ تاویل بلکہ شاید تحریف تک کی جرأت کیا معمولی جرأت ہے ۱۲

میں تو اس وقت صرف یہ بتانا چاہتا تھا کہ سیاسی خرخشوں کے بعد جتنے اصولی اختلافات بھی مسلمانوں میں پیدا ہوئے۔ اگر سراغ لگایا جائے تو پتہ چلے گا کہ ان کا رشتہ اسلام سے نہیں بلکہ اسلامی دائرے کے بیرونی قصوں سے بھی رہا یہی جہم تھا جس نے خدا کو ہوا ٹھہراتے ہوئے ہر چیز میں ہر چیز کے ساتھ بتاتے ہوئے دعویٰ کیا کہ کوئی چیز اس سے خالی نہیں، بایں ہمہ وہ اس تنزیہی عقیدے کا داعی تھا کہ

لا اصفه بوصف يجوز اطلاقه على غيره ص۲۹۴ فتح الباری ج ۱۳ — ہر ایسی صفت جس کا انتساب غیر خدا کی طرف ہوتا ہو، ہم خدا کی طرف اس صفت کو منسوب نہیں کر سکتے

اسی لئے خدا کو حی (زندہ)، عالم (دانا)، مرید (ارادہ کرنے والا) کہنا یا وہ سنتا ہے، دیکھتا ہے، ان باتوں کے انتساب کو وہ ناجائز قرار دیتا تھا، مشہور ہے کہ امام ابوحنیفہ نے جہم کی تنزیہی تعلیم کو سن کر کہا تھا کہ مآل اس کا یہی ہے کہ خدا گویا کچھ نہیں ہے، معدوم ہے، واقعہ یہاں بھی وہی تھا کہ لیس کمثلہ شئی کی بنیاد پر خدائی صفات کو مخلوقات کے صفات پر قیاس کرنا صحیح نہ ہوگا لیکن قرآن میں خدا کی طرف جن صفات کا انتساب کیا گیا ہے ان کا کلیۃً انکار کیسے کیا جا سکتا ہے، پھر اس کے اسی تنزیہی ادعائے کلام کے مسئلہ کو پیدا کیا کہتا تھا کہ کلام تو مخلوق کی صفت ہے خدا اس سے کیسے موصوف ہو سکتا ہے۔

بہر حال جہم پہلا آدمی تھا جس نے خدا کی صفت کلام کا انکار کر کے قرآن کو بجائے کلام اللہ کے مخلوق اللہ کہنے کا مشورہ مسلمانوں کو دیا۔ قرآن مخلوق ہے۔ یا غیر مخلوق ہے اس مسئلہ کے تاریخی تفصیلات سے لوگ عموماً واقف ہیں، ابتدائی بنیاد اس کی جہم ہی نے رکھی تھی[1]

ارباب صدق وصفا، اخلاص ووفا کو اس راہ میں جن شدائد و مصائب سے گذرنا پڑا، خصوصاً سراج الامت سیدنا حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے جس بے جگری اور پامردی کے ساتھ اس فتنہ کا مقابلہ کیا اسلامی تاریخ کے اوراق میں سنہرے حروف میں یہ داستان آج تک لکھی ہوئی ہے،

اسی طرح الثانی وجود کا شعوری نقطہ یا ذات کا احساس عربی میں جیسے "انا" فارسی میں "من" اور

---

[1] اس موقعہ پر یہ یاد رکھنے کی بات ہے کہ ٹھیک ان ہی دنوں میں ہمارے وطن ہندوستان میں یہ مسئلہ مذہبی دائرے میں چھڑا ہوا تھا کہ وید کے شبد یعنی کلام قدیم ہے یا حادث" میمانسا والے قدیم مانتے تھے نیائے والے حادث۔ دیکھو قرون وسطی میں ہندوستانی تہذیب ص۱۱

ہم ہندوستان والے "میں" کے لفظ کا اطلاق جس پر کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جیسے دنیا کی ہر چیز "شی" ہے "شی" کے نیچے ہمارے وجود کا یہ شعوری نقطہ بھی داخل ہے۔ ایسی صورت میں یہ بات کہ کسی شے سے خدا غایب نہیں ہے بلکہ قرآنی الفاظ میں

وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ — اور اللہ ہر چیز پر شاہد (حاضر) ہے

کا کھلا ہوا اقتضا یہی ہے کہ جب ہمارے وجود کا یہ شعوری نقطہ "انا" بھی شے ہے تو حق تعالیٰ کا "انا" کے لئے شہید و حاضر ہونا، قرآن ہی کی سکھائی ہوئی بات ہے، یہی منوایا گیا تھا اسی کو مسلمان مانتے چلے آتے تھے۔ ایک جاہل ان پڑھ مسلمان بھی اپنے آپ کو مثلاً کسی مصیبت میں جب مبتلا پاتا ہے تو دل ہی دل میں وہ اسی "علی کل شی شہید" ہستی کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے اور اندر ہی اندر سوال و جواب کا سلسلہ بھی شروع کر دیتا ہے، یہ روزمرہ کے تجربہ کی بات ہے۔ ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ کے شعور کو اپنے "انا" میں اگر وہ نہیں پاتا تو اضطراراً یہ حرکت اس سے کبھی سرزد نہ ہوتی بلکہ شاید اس احساس و شعور کے لئے تو مسلمان ہونا بھی ضروری نہیں بظاہر آدمی کا یہ فطری احساس معلوم ہوتا ہے، بہر حال نظر کے سامنے نور ہو اور نور کا شعور نظر کو نہ ہو۔ شنوائی کی قوت تک آواز پہنچ جائے اور آواز کو شنوائی کی قوت محسوس نہ کرے جیسے یہ نہیں ہو سکتا، اسی طرح انسانی وجود کا وہ حصہ جو "مطلق شعور" اور شعور ہی شعور ہے، جب حق تعالیٰ اس سے غائب نہیں ہیں بلکہ اس شعوری نقطہ پر بھی وہ شاہد اور حاضر ہیں تو "انا" کے لئے ذات حق کا شعور ظاہر ہے کہ ایک بدیہی بات ہے، لیکن اس سے نہ آدمی کا "انا" "حق" بن جاتا ہے اور نہ کسی طرح یہ سمجھنا درست ہو سکتا ہے کہ حق انا ہے، کیا بینائی نور ہے یا شنوائی کی قوت آواز ہے، بات بالکل واضح اور کھلی ہوئی تھی لیکن جانتے ہیں سب سے پہلے "انا الحق" کا نعرہ مسلمانوں میں جس نے لگایا۔ یعنی حسین بن منصور جو عوام میں منصور ہی کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں۔ جانتے ہیں کہ اس منصوری دعوی کے مدعی حسین بن منصور کون تھے؟

الخطیب اپنی تاریخ بغداد میں اطلاع دیتے ہیں کہ

کان جدہ مجوسیا ؟ اسمہ محمی (ص ) — حسین بن منصور کا دادا مجوسی تھا نام اس کا "محمی" تھا

اھل نبضاء فارس ص۱۱۲ج۸ — ایران کے شہر بیضا کار ہنے والا تھا۔

اور صرف یہی نہیں خطیب نے حسین بن منصور کے صاحبزادے احمد نامی کے حوالہ سے ایک طویل روایت نقل کی ہے جس میں یہ خبر بھی دی گئی ہے کہ ان کے والد حسین بن منصور نے

قصد الی الھند ص۱۱۳ — ہندوستان کا ارادہ کیا

لکھا ہے کہ ہندوستان سے پھر ماوراء النہر ترکستان اور ماچین بھی گئے تھے یہ بھی اسی روایت میں ہے کہ

لما رجع کانوا یکاتبونہ من الھند — لوگ ہندوستان سے خط وکتابت بھی حسین بن منصور

ص۱۱۳ — (اس کے والد) سے کرتے تھے

اور یہ روایت تو حسین بن منصور کے صاحبزادے کی ہے اسی زمانہ میں عباسی خلیفہ معتضد باللہ نے علی بن احمد الحاسب کو ہندوستان جانے کا حکم دیا تھا علی بن احمد کے الفاظ ہیں کہ

وجھنی المعتضد الی الھند لامور — ہندوستان کے متعلق چند خاص امور کے دریافت کرنے

اتعرفھا لیقف علیھا ص۱۲۰ ج۸ — کے لئے معتضد نے مجھے ہندروانہ کیا، خلیفہ خود ان امور

سے آگاہی حاصل کرنا چاہتا تھا۔

علی الحاسب کا بیان ہے کہ جس جہاز پر سوار ہو کر ہم ہندوستان کی طرف روانہ ہوتے، تو دیکھا کہ اسی جہاز میں ایک شخص حسین بن منصور بھی سوار ہے ملنے جلنے، بات چیت کرنے میں بہت اچھا آدمی تھا۔ جب ہم ہندوستان کے ساحل پر پہنچے اور قلیوں نے جہاز سے سامان اتارنا شروع کیا تب میں نے حسین سے پوچھا کہ

ایش جئت ھاھنا — تم کس ضرورت سے یہاں (ہندوستان) آئے ہو

جواب میں علی الحاسب کی روایت ہے کہ حسین نے کہا کہ میں ہندوستان کے لوگوں سے سحر سیکھنا چاہتا ہوں۔

شاید اسی جہاز میں المزین نامی آدمی بھی تھا اس نے بھی حسین کو ہندوستان کے ساحل پر اترتے

---

لہ المزین جو تھا یا حجاموں کو مزین اس زمانہ میں جو کہتے تھے، اس لئے المزین کے نام سے موسوم ہوا واللہ اعلم

دیکھا تھا اور اس سے بھی حسین نے کہا تھا کہ میں یہاں کے لوگوں سے سحر سیکھنا چاہتا ہوں۔ واللہ اعلم سحر کے لفظ سے مراد کیا تھی۔ بظاہر "یوگا" یا جوگ" جو اس ملک کے باشندوں کا خاص فن تھا اسی کا سیکھنا مقصود ہو۔ علی المحاسب کی روایت میں ہے کہ ساحل پر اترنے کے بعد میں نے دیکھا کہ دریا کے کنارے ایک کٹیا بنی ہوئی ہے اس میں ایک بوڑھا آدمی نظر آیا، حسین اسی بوڑھے کی کٹیا میں چلا گیا اور سحر کے متعلق باتیں دریافت کرنی شروع کیں۔ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ کسی جوگی ہی سے اس کی ملاقات ہوئی تھی خود حسین کی زندگی کے تفصیلات اس کتاب میں جو پائے جاتے ہیں ان سے بھی پتہ چلتا ہے کہ حسین کی زندگی مدتوں جوگیوں ہی کی زندگی رہی

بہرحال اس وقت نہ مجھے حسین بن منصور کی شخصیت سے بحث ہے اور نہ ان کے مسئلہ "انا الحق"[1] سے بلکہ کہنا یہ چاہتا ہوں کہ ایک سیدھی سادی بات کو مسلمانوں کی تاریخ میں غیر معمولی اہمیت جو حاصل ہو گئی عموماً یہ کیفیت بیرونی موثرات ہی نے پیدا کی ہے۔ ایسے مسائل جن میں مختلف پہلوؤں کی گنجائش ہو۔ اور کچھ یہ بھی صحیح اور وہ بھی صحیح ہو" بجائے کچھ" کے ایک ہی پہلو پر زور دینے کا آخری نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ اصل حقیقت نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی ہے اور آدمی مغالطہ کا شکار ہو جاتا ہے۔ درحقیقت یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے یہ نہیں ہے کہ قرآن کو نہیں مانا تھا، اور قرآن کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہ لاتے تھے لیکن انھوں نے پیغمبر قرآن کے ساتھ تعلیمی نسبت تزکیہ سے پہلے قائم کرلی۔ حالانکہ قرآن ہی میں کہہ دیا گیا تھا کہ قرآن کی پیغمبر آیتیں تلاوت کرتے ہیں پھر ماننے والوں کے اندر کی غلطیوں کو صاف کرتے ہیں تب تعلیم دیتے ہیں[2] مگر صفائی جن کی مکمل نہیں ہوئی تھی، انھوں نے قرآنی تعلیمات سے استفادہ کا ارادہ کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جو کچھ پہلے سے ان کے پاس تھا کچھ تبدیلی اس میں ضرور ہوئی لیکن قرآنی تعلیمات اپنے صحیح خط و خال کے ساتھ ان میں جاگزیں نہ ہو سکے ان کا طریقہ عمل غیر فطری تھا جس کا لازمی نتیجہ یہی ہو سکتا تھا جو ہوا۔

---

[1] شنکر آچاریہ جو ساتویں صدی عیسوی کے ابعد کے ہندوستانی مشہور ریفارمر ہیں، ان کا نظریہ تھا کہ آتما اور پرماتما میں دوئی نہیں ہے ص۱۱۲ قرون وسطیٰ میں ہندوستانی تہذیب۔ [2] یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَکِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَةَ" مشہور قرآنی آیت کا یہی اقتضا ہے۔